تفہیم القرآن

اَلتَّغَابُن

(۲)

* پس ایمان لاؤ اللہ پر، اور اُس کے رسول پر، اور اُس روشنی پر جو ہم نے نازل کی ہے[۱۸]۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (اِس کا پتہ تمہیں اس روز چل جائے گا) جب اجتماع کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا[۱۹]۔ وہ دن ہوگا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا[۲۰]۔ جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک

---

[۱۸] یعنی جب یہ واقعہ ہے اور پُوری انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ قوموں کی تباہی کا اصل موجب اُن کا رسولوں کی بات نہ ماننا اور آخرت کا انکار کرنا تھا، تو اُسی غلط روش پر چل کر اپنی شامت بلانے پر اصرار نہ کرو اور اللہ اور اس کے رسول اور قرآن کی پیش کردہ ہدایت پر ایمان لے آؤ۔ یہاں سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ روشنی سے مراد قرآن ہے۔ جس طرح روشنی خود نمایاں ہوتی ہے اور گردوپیش کی اُن تمام چیزوں کو نمایاں کر دیتی ہے جو پہلے تاریکی میں چھپی ہوئی تھیں، اسی طرح قرآن ایک ایسا چراغ ہے جس کا برحق ہونا بجائے خود روشن ہے، اور اس کی روشنی میں انسان ہر اُس مسئلے کو سمجھ سکتا ہے جسے سمجھنے کے لیے اس کے اپنے ذرائع علم و عقل کافی نہیں ہیں۔ یہ چراغ جس شخص کے پاس ہو وہ فکر و عمل کی بے شمار پُرپیچ راہوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ صاف صاف دیکھ سکتا ہے اور عمر بھر صراطِ مستقیم پر اس طرح چل سکتا ہے کہ ہر قدم پر اُسے یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ گمراہیوں کی طرف لے جانے والی پگ ڈنڈیاں کدھر کدھر جا رہی ہیں اور ہلاکت کے گڑھے کہاں کہاں آ رہے ہیں اور سلامتی کی راہ ان کے درمیان کونسی ہے۔

[۱۹] اجتماع کے دن سے مراد ہے قیامت، اور سب کو اکٹھا کرنے سے مُراد ہے تمام اُن انسانوں کو بیک وقت زندہ کر کے جمع کرنا جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک دنیا میں پیدا ہوتے ہوں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں جگہ جگہ

کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں فرمایا ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ، "وہ ایک ایسا دن ہوگا جس میں سب انسان جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اُس روز ہوگا سب کی آنکھوں کے سامنے ہوگا (آیت ۱۰۳)، اور سورۂ واقعہ میں فرمایا قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ "ان سے کہو کہ تمام پہلے گزرے ہوئے اور بعد میں آنے والے لوگ یقیناً ایک مقرر دن کے وقت جمع کیے جانے والے ہیں (آیت ۵۰)۔

۱۳؎ اصل میں لفظ یَوْمُ التَّغَابُنِ استعمال ہوا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ اُردو زبان تو کیا کسی دوسری زبان کے بھی ایک لفظ، بلکہ ایک فقرے میں اس کا مفہوم ادا نہیں کیا جا سکتا۔ خود قرآن مجید میں بھی قیامت کے جتنے نام آئے ہیں، ان میں غالباً سب سے زیادہ پُرمعنی نام یہی ہے۔ اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تشریح ناگزیر ہے۔

تغابُن غبن سے ہے جس کا تلفظ غَبْن بھی ہے اور غَبَن بھی۔ غَبْن زیادہ تر خرید و فروخت اور لین دین کے معاملہ میں بولا جاتا ہے، اور غَبَن رائے کے معاملہ میں۔ لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں اس کے متعدد معنی بیان کیے گئے ہیں: غَبَنُوْا خَيْرَ النَّاقَةِ "اُن لوگوں کو پتہ نہیں چلا کہ اُن کی اونٹنی کہاں گئی"۔ غَبَنَ فُلَانًا فِي الْبَيْعِ "اُس نے فلاں شخص کو خرید و فروخت میں دھوکا دے دیا"۔ غَبَنَ فُلَانًا "اس نے فلاں شخص کو گھاٹا دے دیا"۔ غَبِنْتُ مِنْ حَقِّيْ عِنْدَ فُلَانٍ "فلاں شخص سے اپنا حق وصول کرنے میں مجھ سے بھول ہو گئی"۔ غَبِيْن "وہ شخص جس میں ذہانت کی کمی ہو اور جس کی رائے کمزور ہو"۔ مَغْبُوْن "وہ شخص جو دھوکا کھا جاتے"۔ اَلْغَبْنُ، اَلْغَفْلَةُ، اَلنِّسْيَانُ، فَوْتُ الْحَظِّ، اَنْ يَّبْخَسَ صَاحِبُكَ فِيْ مُعَامَلَةٍ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ لِضَرْبٍ مِّنَ الْاِخْفَاءِ "غبن کے معنی ہیں غفلت، بھول، اپنے حصے سے محروم رہ جانا، ایک شخص کا کسی غیر محسوس طریقے سے کاروبار یا باہمی معاملہ میں دوسرے کو نقصان دینا"۔ امام حسن بصریؒ نے دیکھا کہ ایک شخص دوسرے کو بیع میں دھوکا دے رہا ہے تو فرمایا هٰذَا يَغْبِنُ عَقْلَكَ "یہ شخص تجھے بیوقوف بنا رہا ہے"۔

اس سے جب لفظ تغابُن بنایا جائے تو اس میں دو یا زائد آدمیوں کے درمیان غبن واقع ہونے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ تَغَابَنَ الْقَوْمُ کے معنی ہیں بعض لوگوں کا بعض لوگوں کے ساتھ غبن کا معاملہ کرنا۔ یا ایک شخص کا دوسرے کو نقصان پہنچانا اور دوسرے کا اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا جانا۔ یا ایک کا حصہ دوسرے کو مل جانا

اور اُس کا اپنے حصّے سے محروم رہ جانا۔ یا تجارت میں ایک فریق کا خسارہ اٹھانا اور دوسرے فریق کا نفع اٹھالے جانا۔ یا کچھ لوگوں کا کچھ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں غافل یا ضعیف الرائے ثابت ہونا۔

اب اِس بات پر غور کیجیے کہ آیت میں قیامت کے متعلق فرمایا گیا ہے ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ "وہ دن ہوگا تغابُن کا"۔ اِن الفاظ سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ دنیا میں تو شب و روز تغابُن ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن یہ تغابُن ظاہری اور نظر فریب ہے، اصلی اور حقیقی تغابُن نہیں ہے۔ اصل تغابُن قیامت کے روز ہوگا۔ وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ اصل میں خسارہ کس نے اٹھایا اور کون نفع کما لے گیا۔ اصل میں کس کا حصّہ کسے مل گیا اور کون اپنے حصّے سے محروم رہ گیا۔ اصل میں دھوکا کس نے کھایا اور کون ہوشیار نکلا۔ اصل میں کس نے اپنا تمام سرمایۂ حیات ایک غلط کاروبار میں کھپا کر اپنا دیوالہ نکال دیا، اور کس نے اپنی قوتوں اور قابلیتوں اور مساعی اور اموال اور اوقات کو نفع کے سودے پر لگا کر وہ سارے فائدے لوٹ لیے جو پہلے شخص کو بھی حاصل ہو سکتے تھے اگر وہ دنیا کی حقیقت سمجھنے میں دھوکا نہ کھاتا۔

مفسّرین نے یوم التغابُن کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے متعدّد مطلب بیان کیے ہیں جو سب کے سب صحیح ہیں اور اس کے معنی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض مفسّرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اُس روز اہلِ جنت اہلِ دوزخ کا وہ حصّہ مار لے جائیں گے جو اُن کو جنت میں ملتا اگر وہ جنتیوں کے سے کام کر کے آئے ہوتے، اور اہلِ دوزخ جنتیوں کا وہ حصّہ لوٹ لیں گے جو انہیں دوزخ میں ملتا اگر انہوں نے دنیا میں دوزخیوں کے سے کام کیے ہوتے۔ اس مضمون کی تائید بخاری کی وہ حدیث کرتی ہے جو انہوں نے کتاب الرّقاق میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "جو شخص بھی جنت میں جائے گا اُسے وہ مقام دکھایا جائے گا جو اُسے دوزخ میں ملتا اگر وہ بُرا عمل کرتا، تاکہ وہ اور زیادہ شکر گزار ہو۔ اور جو شخص بھی دوزخ میں جائے گا اسے وہ مقام دکھا دیا جائے گا جو اُسے جنت میں ملتا اگر اس نے نیک عمل کیا ہوتا، تاکہ اسے اور زیادہ حسرت ہو"۔

بعض اور مفسّرین کہتے ہیں کہ اُس روز ظالم کی اُتنی نیکیاں مظلوم لوٹ لے جائے گا جو اس کے ظلم کا بدلہ ہو سکیں، یا مظلوم کے اُتنے گناہ ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے جو اس کے حق کے برابر وزن رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ قیامت کے روز آدمی کے پاس کوئی مال و زر تو ہوگا نہیں کہ وہ مظلوم کا حق ادا کرنے کے لیے کوئی ہرجانہ یا تاوان

دے سکے۔ وہاں تو بس آدمی کے اعمال ہی ایک زرِ مبادلہ ہوں گے۔ لہٰذا جس شخص نے دنیا میں کسی پر ظلم کیا ہو وہ مظلوم کا حق اسی طرح ادا کر سکے گا کہ اپنے پلّے میں جو کچھ بھی نیکیاں رکھتا ہو ان میں سے اس کا تاوان ادا کرے، یا مظلوم کے گناہوں میں سے کچھ اپنے اوپر لے کر اس کا جرمانہ بھگتے۔ یہ مضمون بھی متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ بخاری، کتاب الرقاق میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "جس شخص کے ذمہ اپنے کسی بھائی پر کسی قسم کے ظلم کا بار ہو اُسے چاہیے کہ یہیں اس سے سبکدوش ہو لے، کیونکہ آخرت میں دینار و درہم تو ہوں گے ہی نہیں۔ وہاں اس کی نیکیوں میں سے کچھ لے کر مظلوم کو دلوائی جائیں گی، یا اگر اس کے پاس نیکیاں کافی نہ ہوں تو مظلوم کے کچھ گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے۔" اسی طرح مُسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ بن اُنیس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "کوئی جنتی جنت میں اور کوئی دوزخی دوزخ میں اس وقت تک نہ جا سکے گا جب تک کہ اُس ظلم کا بدلہ نہ چکا دیا جائے جو اس نے کسی پر کیا ہو، حتیٰ کہ ایک تھپڑ کا بدلہ بھی دینا ہوگا۔" ہم نے عرض کیا کہ یہ بدلہ کیسے دیا جائے گا جبکہ قیامت میں ہم ننگے بُچے ہوں گے؟ فرمایا "اپنے اعمال کی نیکیوں اور بدیوں سے بدلہ چکانا ہوگا۔"

مُسلم اور مُسند احمد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ اپنی مجلس میں لوگوں سے پوچھا "جانتے ہو مُفلس کون ہوتا ہے؟" لوگوں نے عرض کیا ہم میں سے مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال متاع کچھ نہ ہو۔ فرمایا "میری اُمت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز نماز اور روزہ اور زکوٰۃ ادا کر کے حاضر ہوا ہو، مگر اس حال میں آیا ہو کہ کسی کو اس نے گالی دی تھی اور کسی پر بُہتان لگایا تھا اور کسی کا مال مار کھایا تھا اور کسی کا خون بہایا تھا اور کسی کو مار اپیٹا تھا۔ پھر ان سب مظلوموں میں سے ہر ایک پر اس کی نیکیاں لے لے کر بانٹ دی گئیں۔ اور جب نیکیوں میں سے کچھ نہ بچا جس سے ان کا بدلہ چکایا جا سکے تو ان میں سے ہر ایک کے کچھ کچھ گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے گئے، اور وہ شخص دوزخ میں پھینک دیا گیا۔" ایک اور حدیث میں، جسے مُسلم اور ابوداؤد نے حضرت بُریدہ سے نقل کیا ہے، حضورؐ نے فرمایا کہ "کسی مجاہد کے پیچھے اگر کسی شخص نے اس کی بیوی اور اس کے گھر والوں کے معاملہ میں خیانت کی تو قیامت کے روز وہ اُس مجاہد کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا اور اس کو کہا جائے گا کہ اِس کی نیکیوں میں سے جو کچھ تو چاہے لے لے۔" پھر حضورؐ نے ہماری طرف

متوجہ ہو کر فرمایا: "پھر تمہارا کیا خیال ہے؟" یعنی تم کیا اندازہ کرتے ہو کہ وہ اُس کے پاس کیا چھوڑ دے گا؟

بعض اور مفسرین نے کہا ہے کہ تغابن کا لفظ زیادہ تر تجارت کے معاملہ میں بولا جاتا ہے۔ اور قرآن مجید میں جگہ جگہ اُس رویے کو جو کافر اور مومن اپنی دنیا کی زندگی میں اختیار کرتے ہیں، تجارت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مومن اگر نافرمانی کا راستہ چھوڑ کر اطاعت اختیار کرتا ہے اور اپنی جان، مال اور محنتیں خدا کے راستے میں کھپا دیتا ہے تو گویا وہ گھاٹے کا سودا چھوڑ کر ایک ایسی تجارت میں اپنا سرمایہ لگا رہا ہے جو آخر کار نفع دینے والی ہے۔ اور ایک کافر اگر اطاعت کی راہ چھوڑ کر خدا کی نافرمانی اور بغاوت کی راہ میں اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے تو گویا وہ ایک ایسا تاجر ہے جس نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی ہے اور آخر کار وہ اس کا خسارہ اٹھانے والا ہے۔ دونوں کا نفع اور نقصان قیامت کے روز ہی کھلے گا۔ دنیا میں یہ ہو سکتا ہے کہ مومن سراسر گھاٹے میں رہے اور کافر بڑے فائدے حاصل کرتا رہے۔ مگر آخرت میں جا کر معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں نفع کا سودا کس نے کیا ہے اور نقصان کا سودا کس نے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل ملاحظہ ہوں: البقرہ، آیات ۱۶-۱۷۵-۲۰۷۔ آل عمران ۷۷-۱۷۷۔ النساء ۷۴۔ التوبہ ۱۱۱۔ النحل ۹۵۔ فاطر ۲۹۔ الصف ۱۰۔

ایک اور صورت تغابن کی یہ بھی ہے کہ دنیا میں لوگ کفر و فسق اور ظلم و عصیان پر بڑے اطمینان سے آپس میں تعاون کرتے رہتے ہیں اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بڑی گہری محبت اور دوستی ہے۔ بدکردار خاندانوں کے افراد، ضلالت پھیلانے والے پیشوا اور اُن کے پیرو، چوروں اور ڈاکوؤں کے جتھے، رشوت خور اور ظالم افسروں اور ملازمین کے گٹھ جوڑ، بے ایمان تاجروں، صنعت کاروں اور زمینداروں کے گروہ، گمراہی اور شرارت و خباثت برپا کرنے والی پارٹیاں، اور بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں ظلم و فساد کی علمبردار حکومتیں اور قومیں، سب کا باہمی ساز باز اسی اعتماد پر قائم ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق رکھنے والے افراد اس گمان میں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے رفیق ہیں اور ہمارے درمیان بڑا کامیاب تعاون چل رہا ہے۔ مگر جب یہ لوگ آخرت میں پہنچیں گے تو اُن پر یکایک یہ بات کھلے گی کہ ہم سب نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرے گا کہ جسے میں اپنا بہترین باپ، بھائی، بیوی، شوہر، اولاد، دوست، رفیق، لیڈر، پیر، مرید، یا حامی و مددگار سمجھ رہا تھا وہ دراصل میرا بدترین دشمن تھا۔ ہر رشتہ داری اور دوستی اور عقیدت و محبت، عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔ سب ایک دوسرے

عمل کرتا ہے[۲۱]، اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی۔ یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے[۲۲] وہ دوزخ کے باشندے ہونگے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔ ؏

[۲۳] کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اِذن ہی سے آتی ہے[۲۴]۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو اللہ اس کے

کو گالیاں دینگے، ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، اور ہر ایک یہ چاہے گا کہ اپنے جرائم کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر اسے سخت سے سخت سزا دلوائے۔ یہ مضمون بھی قرآن میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے جس کی چند مثالیں حسبِ ذیل آیات میں دیکھی جا سکتی ہیں: البقرہ ۱۶۷۔ الاعراف ۳۸ تا ۳۹۔ ابراہیم ۲۱-۲۲۔ المومنون ۱۰۱۔ العنکبوت ۱۲-۱۳-۲۵۔ لقمٰن ۳۳۔ الاحزاب ۶۷-۶۸۔ سبا ۳۱ تا ۳۳۔ فاطر ۱۸۔ الصّٰفّٰت ۲۷ تا ۳۳۔ صٓ ۵۹ تا ۶۱۔ حٰمٓ السجدہ ۲۹۔ الزُّخرُف ۶۷۔ الدُّخان ۴۱۔ المعارج ۱۰ تا ۱۴۔ عبس ۳۴ تا ۳۷۔

۲۱؎ اللہ پر ایمان لانے سے مراد محض یہ مان لینا نہیں ہے کہ اللہ موجود ہے، بلکہ اُس طریقے سے ایمان لانا مُراد ہے جس طرح اللہ نے خود اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے بتایا ہے۔ اس ایمان میں ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب آپ سے آپ شامل ہے۔ اسی طرح نیک عمل سے مراد بھی ہر وہ عمل نہیں ہے جسے آدمی نے خود نیکی سمجھ کر یا انسانوں کے کسی خود ساختہ معیارِ اخلاق کی پیروی کرتے ہوئے اختیار کر لیا ہو، بلکہ اس سے مراد وہ عملِ صالح ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے قانون کے مطابق ہو۔ لہٰذا کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ رسُول اور کتاب کے واسطے کے بغیر اللہ کو ماننے اور نیک عمل کرنے کے وہ نتائج ہیں جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔ قرآن مجید کا جو شخص بھی سمجھ کر مطالعہ کرے گا اُس سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے گی کہ قرآن کی رُو سے اِس طرح کے کسی ایمان کا نام ایمان باللہ، اور کسی عمل کا نام عملِ صالح سرے سے ہے ہی نہیں۔

۲۲؎ یہ الفاظ خود کفر کے مفہوم کو واضح کر دیتے ہیں۔ کتاب اللہ کی آیات کو اللہ کی آیات نہ ماننا، اور ان حقائق کو تسلیم نہ کرنا جو ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں، اور ان احکام کی پیروی سے انکار کر دینا جو اُن میں ارشاد ہوئے ہیں، یہی کفر ہے اور اس کے نتائج وہ ہیں جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔

۲۳؎ اب روئے سخن اہلِ ایمان کی طرف ہے۔ اِس سلسلۂ کلام کو پڑھتے ہوئے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ

دل کو ہدایت بخشتا ہے[۲۵]، اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے[۲۶]۔ اللہ کی اطاعت کرو اور رسُول کی طاعت کرو۔ لیکن اگر

جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں وہ مسلمانوں کے لیے سخت مصائب کا زمانہ تھا۔ مکہ سے برسوں ظلم سہنے کے بعد اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آگئے تھے۔ اور مدینے میں جن حق پرستوں نے ان کو پناہ دی تھی اُن پر دُہری مصیبت آپڑی تھی۔ ایک طرف انہیں سینکڑوں مہاجرین کو سہارا دینا تھا جو عرب کے مختلف حصّوں سے اُن کی طرف چلے آرہے تھے، اور دوسری طرف پورے عرب کے اعدائے اسلام اُن کے درپے آزار ہو گئے تھے۔

۲۴؎ یہ مضمون سورۃ الحدید، آیات ۲۲-۲۳ میں بھی گزر چکا ہے اور وہاں حواشی نمبر ۳۹ تا ۴۲ میں ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ جن حالات میں اور جس مقصد کے لیے یہ بات وہاں فرمائی گئی تھی، اُسی طرح کے حالات میں اسی مقصد کے لیے اِسے یہاں دُہرایا گیا ہے۔ جو حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ نہ مصائب خود آجاتے ہیں، نہ دنیا میں کسی کی یہ طاقت ہے کہ اپنے اختیار سے جس پر جو مصیبت چاہے نازل کر دے۔ یہ تو سراسر اللہ کے اِذن پر موقوف ہے کہ کسی پر کوئی مصیبت نازل ہونے دے یا نہ ہونے دے۔ اور اللہ کا اذن بہر حال کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر ہوتا ہے جسے انسان نہ جانتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔

۲۵؎ یعنی مصائب کے ہجوم میں جو چیز انسان کو راہِ راست پر قائم رکھتی ہے اور کسی سخت سے سخت حالت میں بھی اس کے قدم ڈگمگانے نہیں دیتی وہ صرف ایمان باللہ ہے۔ جس کے دل میں ایمان نہ ہو وہ آفات کو یا تو اتفاقات کا نتیجہ سمجھتا ہے، یا دنیوی طاقتوں کو اُن کے لانے اور روکنے میں مؤثر مانتا ہے، یا انہیں ایسی خیالی طاقتوں کا عمل سمجھتا ہے جنہیں انسانی اَوہام نے نفع و ضرر پہنچانے پر قادر فرض کر لیا ہے، یا خدا کو فاعلِ مختار مانتا تو ہے مگر صحیح ایمان کے ساتھ نہیں مانتا۔ اِن تمام مختلف صورتوں میں آدمی کم ظرف ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک خاص حد تک تو وہ مصیبت سہہ لیتا ہے، لیکن اس کے بعد وہ گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ ہر آستانے پر جھک جاتا ہے۔ ہر ذلّت قبول کر لیتا ہے۔ ہر کمینہ حرکت کر سکتا ہے۔ ہر غلط کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ خدا کو گالیاں دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ حتیٰ کہ خودکشی تک کر گزرتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص یہ جانتا اور سچے دل سے مانتا ہو کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اِس کائنات کا مالک و فرمانروا ہے، اور اسی کے اذن سے مصیبت آتی اور اسی کے حکم سے ٹل سکتی ہے، اُس کے دل کو اللہ صبر و تسلیم اور رضا بقضاء کی توفیق دیتا ہے، اس کو عزم اور ہمت کے ساتھ ہر طرح کے

تم اطاعت سے منہ موڑتے ہو تو ہمارے رسول پر صاف صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے

حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتا ہے۔ تاریک سے تاریک حالات میں بھی اس کے سامنے اللہ کے فضل کی امید کا چراغ روشن رہتا ہے، اور کوئی بڑی سے بڑی آفت بھی اس کو اتنا پست ہمت نہیں ہونے دیتی کہ وہ راہ راست سے ہٹ جائے، یا باطل کے آگے سر جھکا دے، یا اللہ کے سوا کسی اور کے در پر اپنے درد کا مداوا ڈھونڈنے لگے۔ اس طرح ہر مصیبت اس کے لیے مزید خیر کے دروازے کھول دیتی ہے اور کوئی مصیبت بھی حقیقت میں اس کے لیے مصیبت نہیں رہتی بلکہ نتیجے کے اعتبار سے سراسر رحمت بن جاتی ہے، کیونکہ خواہ وہ اُس کا شکار ہو کر رہ جائے یا اس سے بخیریت گزر جائے، دونوں صورتوں میں وہ اپنے رب کی ڈالی ہوئی آزمائش سے کامیاب ہو کر نکلتا ہے۔ اسی چیز کو ایک متفق علیہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے عجباً للمؤمن لا یقضی اللہ لہ قضاءً الا کان خیراً لہ، ان اصابتہ ضراء صبر، فکان خیراً لہ، وان اصابتہ سراء شکر، فکان خیراً لہ، ولیس ذالک لاحد الا المؤمن " مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اللہ اس کے حق میں جو فیصلہ بھی کرتا ہے وہ اس کے لیے اچھا ہی ہوتا ہے۔ مصیبت پڑے تو صبر کرتا ہے، اور وہ اس کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ خوشحالی میسر آئے تو شکر کرتا ہے، اور وہ بھی اس کے لیے اچھا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات مومن کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔"

۲۶؎ اِس سلسلۂ کلام میں اس ارشاد کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کو معلوم ہے کہ کون شخص واقعی ایمان رکھتا ہے اور کس شان کا ایمان رکھتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے علم کی بنا پر اُسی قلب کو ہدایت بخشتا ہے جس میں ایمان ہو، اور اُسی شان کی ہدایت بخشتا ہے جس شان کا ایمان اس میں ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے مومن بندوں کے حالات سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔ اس نے ایمان کی دعوت دے کر، اور اس ایمان کے ساتھ دنیا کی شدید آزمائشوں میں ڈال کر انہیں اُن کے حال پر نہیں چھوڑ دیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس مومن پر دنیا میں کیا کچھ گزر رہی ہے اور وہ کن حالات میں اپنے ایمان کے تقاضے کس طرح پورے کر رہا ہے۔ اس لیے اطمینان رکھو کہ جو مصیبت بھی اللہ کے اذن سے تم پر نازل ہوتی ہے، اللہ کے علم میں ضرور اس کی کوئی عظیم مصلحت ہوتی ہے اور اس کے اندر کوئی بڑی خیر پوشیدہ ہوتی ہے، کیونکہ اللہ اپنے مومن بندوں کا

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، لہٰذا ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے [۲۸]۔ اَے لوگو جو ایمان لاتے ہو، تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے ہوشیار رہو۔ اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے [۲۹]۔ تمہارے

خیر خواہ ہے، بلا وجہ انہیں مصائب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔

۲۷؎ سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اچھے حالات ہوں یا بُرے حالات، ہر حال میں اللہ اور رسول کی اطاعت پر قائم رہو۔ لیکن اگر مصائب کے ہجوم سے گھبرا کر تم اطاعت سے مُنہ موڑ گئے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ ہمارے رسُول پر صرف یہ ذمّہ داری تھی کہ راہِ راست تم کو ٹھیک ٹھیک بتا دے، سو اُس کا حق رسول نے ادا کر دیا ہے۔

۲۸؎ یعنی خدائی کے سارے اختیارات تنہا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ کوئی دوسرا سرے سے یہ اختیار رکھتا ہی نہیں ہے کہ تمہاری اچھی یا بُری تقدیر بنا سکے۔ اچھا وقت آسکتا ہے تو اُسی کے لائے آسکتا ہے، اور بُرا وقت ٹل سکتا ہے تو اُسی کے ٹالے ٹل سکتا ہے۔ لہٰذا جو شخص سچے دل سے اللہ کو خدائے واحد مانتا ہو اُس کے لیے اِس کے سوا سرے سے کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ وہ اللہ پر بھروسا رکھے اور دنیا میں ایک مومن کی حیثیت سے اپنا فرض اِس یقین کے ساتھ انجام دیتا چلا جائے کہ خیر بہر حال اُسی راہ میں ہے جس کی طرف اللہ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اس راہ میں کامیابی نصیب ہوگی تو اللہ ہی کی مدد اور تائید و توفیق سے ہوگی، کوئی دوسری طاقت مدد کرنے والی نہیں ہے۔ اور اس راہ میں اگر مشکلات و مصائب اور خطرات و مہالک سے سابقہ پیش آئے گا تو اُن سے بھی وہی بچائے گا، کوئی دوسرا بچانے والا نہیں ہے۔

۲۹؎ اس آیت کے دو مفہوم ہیں۔ ایک مفہوم کے لحاظ سے اس کا اطلاق اُن بہت سی مشکلات پر ہوتا ہے جو خدا کی راہ پر چلنے میں بکثرت اہلِ ایمان مردوں کو اپنی بیویوں سے اور عورتوں کو اپنے شوہروں سے اور والدین کو اپنی اولاد سے پیش آتی ہیں۔ دنیا میں کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرد کو ایسی بیوی اور ایک عورت کو ایسا شوہر ملے جو ایمان اور راست روی میں پُوری طرح رفیق و مددگار ہو، اور پھر دونوں کو اولاد بھی ایسی میسر ہو جو عقیدہ و عمل اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے۔ ورنہ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ شوہر اگر

نیک اور ایماندار رہے تو بیوی اور اولاد اُسے ایسی ملتی ہے جو اس کی دیانت و امانت اور راست بازی کو اپنے حق میں بدقسمتی سمجھتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ شوہر اور باپ اُن کی خاطر جہنم مول لے اور ان کے لیے حرام و حلال کی تمیز چھوڑ کر ہر طریقے سے عیش و طرب اور فسق و فجور کے سامان فراہم کرے۔ اور اس کے برعکس بسا اوقات ایک نیک مومن عورت کو ایسے شوہر سے سابقہ پیش آتا ہے جسے اس کی پابندی شریعت ایک آنکھ نہیں بھاتی، اور اولاد بھی باپ کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی گمراہی اور بدکرداری سے ماں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ پھر خصوصیت کے ساتھ جب کفر و دین کی کشمکش میں ایک انسان کے ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے دین کی خاطر نقصانات برداشت کرے، طرح طرح کے خطرات مول لے، ملک چھوڑ کر ہجرت کر جائے، یا جہاد میں جا کر اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دے، تو سب سے بڑھ کر اس کی راہ میں اس کے اہل و عیال ہی رکاوٹ بنتے ہیں۔

دوسرے مفہوم کا تعلق اُن مخصوص حالات سے ہے جو اِن آیات کے نزول کے زمانہ میں بکثرت مسلمانوں کو پیش آ رہے تھے اور آج بھی ہر اُس شخص کو پیش آتے ہیں جو کسی غیر مسلم معاشرے میں اسلام قبول کرتا ہے۔ اُس وقت مکہ معظمہ میں اور عرب کے دوسرے حصوں میں عموماً یہ صورت پیش آتی تھی کہ ایک مرد ایمان لے آیا ہے، مگر بیوی بچے نہ صرف اسلام قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ خود اُس کو اسلام سے پھیر دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ اور ایسے ہی حالات سے اُن خواتین کو سابقہ پیش آتا تھا جو اپنے خاندان میں اکیلی اسلام قبول کرتی تھیں۔

یہ دونوں قسم کے حالات جن اہلِ ایمان کو درپیش ہوں انہیں خطاب کرتے ہوئے تین باتیں فرمائی گئی ہیں:

سب سے پہلے انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ دنیوی رشتے کے لحاظ سے اگرچہ یہ لوگ وہ ہیں جو انسان کو سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں، لیکن دین کے لحاظ سے یہ تمہارے "دشمن" ہیں۔ یہ دشمنی خواہ اِس حیثیت سے ہو کہ وہ تمہیں نیکی سے روکتے اور بدی کی طرف مائل کرتے ہوں، یا اِس حیثیت سے کہ وہ تمہیں ایمان سے روکتے اور کفر کی طرف کھینچتے ہوں، یا اس حیثیت سے کہ ان کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ ہوں اور تمہارے ذریعہ سے اگر کوئی بات بھی مسلمانوں کے جنگی رازوں کے متعلق ان کے علم میں آ جائے تو اسے اسلام کے دشمنوں تک پہنچا دیتے ہوں، اس سے دشمنی کی نوعیت و کیفیت میں تو فرق ہو سکتا ہے، لیکن بہر حال یہ ہے دشمنی ہی، اور اگر تمہیں ایمان عزیز ہو تو اِس لحاظ سے تمہیں ان کو دشمن ہی سمجھنا چاہیے، اُن کی محبت میں گرفتار ہو کر کبھی اِس بات کو نہ بھولنا چاہیے کہ تمہارے اور ان کے درمیان ایمان و کفر

یا طاعت و معصیت کی دیوار حائل ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا کہ ان سے ہوشیار رہو، یعنی ان کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت برباد نہ کرلو۔ ان کی محبت کو کبھی اپنے دل میں اس حد تک نہ بڑھنے دو کہ وہ اللہ اور رسول کے ساتھ تمہارے تعلق اور اسلام کے ساتھ تمہاری وفاداری میں حائل ہو جائیں۔ ان پر کبھی اتنا اعتماد نہ کرو کہ تمہاری بے احتیاطی سے مسلمانوں کی جماعت کے اسرار انہیں معلوم ہو جائیں اور وہ دشمنوں تک پہنچیں۔ یہ وہی بات ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ یُوتیٰ برجلٍ یوم القیٰمۃ فیقال اکل عیالہ حسناتہ "ایک شخص قیامت کے روز لایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اس کے بال بچے اس کی ساری نیکیاں کھا گئے"۔

آخر میں فرمایا گیا کہ "اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دشمنی سے تمہیں صرف اس لیے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ تم ان سے ہوشیار رہو اور اپنے دین کو ان سے بچانے کی فکر کرو۔ اس سے آگے بڑھ کر اس تنبیہ کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ بیوی بچوں کو مارنے پیٹنے لگو، یا ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ، یا ان کے ساتھ تعلقات میں ایسی بدمزگی پیدا کر لو کہ تمہاری اور ان کی گھریلو زندگی عذاب بن کر رہ جائے۔ یہ اس لیے کہ ایسا کرنے کے دو نقصانات بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے بیوی بچوں کی اصلاح کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جانے کا خطرہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے معاشرے میں اسلام کے خلاف الٹی بدگمانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور گرد و پیش کے لوگوں کی نگاہ میں مسلمان کے اخلاق و کردار کی یہ تصویر بنتی ہے کہ اسلام قبول کرتے ہی وہ خود اپنے گھر میں اپنے بال بچوں تک کے لیے سخت گیر اور بد مزاج بن جاتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ابتدائے اسلام میں جب لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے تھے، تو ان کو ایک مشکل اس وقت پیش آتی تھی جب ان کے والدین کافر ہوتے تھے اور وہ ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ اس نئے دین سے پھر جائیں۔ اور دوسری مشکل اس وقت پیش آتی جب ان کے بیوی بچے (یا عورتوں کے معاملہ میں ان کے شوہر اور بچے) کفر پر قائم رہتے اور دینِ حق کی راہ سے انہیں پھیرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلی صورت کے متعلق سورۂ عنکبوت (آیت ۸) اور سورۂ لقمان (آیات ۱۴-۱۵) میں یہ ہدایت فرمائی گئی کہ دین کے معاملہ میں والدین کی بات ہرگز نہ مانو، البتہ دنیا کے معاملات میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہو۔ دوسری صورت کا حکم یہاں

مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔[۳۰] لہٰذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو[۳۱]، اور سنو اور اطاعت کرو، اور اپنے مال خرچ کرو، یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اپنے دین کو تو اپنے بال بچوں سے بچانے کی فکر ضرور کرو، مگر ان کے ساتھ سخت گیری کا برتاؤ نہ کرو، بلکہ نرمی اور عفو و درگزر سے کام لو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو التوبہ، آیات ۲۳-۲۴۔ تفہیم القرآن تفسیر سورۂ المجادلہ، حاشیہ ۳۷۔ المُمتحنہ، حواشی ۱ تا ۳۔ المنافقون، حاشیہ ۱۸)۔

۳۰؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الانفال، حاشیہ ۲۳۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نگاہ میں رہنا چاہیے جسے طَبَرانی نے حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت کیا ہے کہ "تیرا اصل دشمن وہ نہیں ہے جسے اگر تو قتل کر دے تو تیرے لیے کامیابی ہے اور وہ تجھے قتل کر دے تو تیرے لیے جنت ہے، بلکہ تیرا اصل دشمن، ہو سکتا ہے کہ تیرا اپنا وہ بچہ ہو جو تیری ہی صلب سے پیدا ہوا ہے، پھر تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ مال ہے جس کا تو مالک ہے۔" اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی اور سورۂ انفال میں بھی یہ فرمایا ہے کہ اگر تم مال اور اولاد کے فتنے سے اپنے آپ کو بچا لے جاؤ اور اُن کی محبت پر اللہ کی محبت کو غالب رکھنے میں کامیاب رہو، تو تمہارے لیے اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔

۳۱؎ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ "اللہ سے ایسا ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے" (آل عمران - ۱۰۲)۔ دوسری جگہ فرمایا لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا "اللہ کسی متنفس کو اس کی استطاعت سے زیادہ کا مُکلّف قرار نہیں دیتا" (البقرہ - ۲۸۶)۔ اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ "جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو"۔ ان تینوں آیتوں کو ملا کر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت وہ معیار ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے جس تک پہنچنے کی ہر مومن کو کوشش کرنی چاہیے۔ دوسری آیت یہ اصولی بات ہمیں بتاتی ہے کہ کسی شخص سے بھی اس کی استطاعت سے زیادہ کام کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اللہ کے دین میں آدمی بس اُتنے ہی کا مکلف ہے جس کی وہ مقدرت رکھتا ہو۔ اور یہ آیت ہر مومن کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ اپنی حد تک تقویٰ کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ جہاں تک بھی اس کے لیے ممکن ہو، اسے اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لانے چاہییں اور اس کی نافرمانی سے بچنا چاہیے۔ اس معاملہ میں اگر وہ خود تساہل سے کام لے گا تو مواخذہ سے نہ بچ سکے گا۔ البتہ

جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔[۳۲] اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا[۳۳] اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا، اللہ بڑا قدر دان اور بردبار ہے[۳۴]، حاضر اور غائب ہر چیز کو جانتا ہے، زبردست اور دانا ہے۔ ع

جو چیز اُس کی مقدرت سے باہر ہوگی (اور اس کا فیصلہ اللہ ہی بہتر کر سکتا ہے کہ کیا چیز کس کی مقدرت سے واقعی باہر تھی)، اُس کے معاملہ میں اُس سے بازپرس نہ کی جائے گی۔

۳۲؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ حشر، حاشیہ ۱۹۔

۳۳؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل۔ البقرہ، حاشیہ ۲۷۔ المائدہ حاشیہ ۳۳۔ جلد پنجم الحدید حاشیہ ۱۶۔

۳۴؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، فاطر، حواشی ۵۲-۵۹۔ الشوریٰ، حاشیہ ۴۲۔

تفہیم القرآن جلد سوم

جو ایک عرصے سے ختم تھی ترمیم و اضافہ اور نظرِ ثانی کے بعد نہایت عمدہ، نفیس کاغذ پر آفسٹ طباعت کے ساتھ از سرِ نو شائع ہو چکی ہے۔ اپنی فرمائش سے مطلع فرمائیں۔

نیز تفہیم القرآن جلد اوّل، دوم، چہارم بھی سٹاک میں موجود ہیں۔

جلد اوّل نظرِ ثانی شدہ آفسٹ ایڈیشن ہدیہ	۲۶/-
جلد دوم 〃 〃 〃 〃 〃	۲۸/-
جلد سوم 〃 〃 〃 〃 〃	۳۲/-
جلد چہارم 〃 〃 〃 〃 〃	۲۶/-

اخراجاتِ ڈاک تقریباً ۲/۵۰ روپے فی جلد۔ بیک وقت پورا سیٹ منگوانے والے حضرات سے ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا۔

مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، موچی دروازہ۔ لاہور